۲۲

فہرستِ کتب قیمۃ

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خمخانہ مے

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

زندگی کے اُن مسائل کے متعلق جن کی تفصیل فہرست میں درج ہے

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

قیمت مجلد، پچار روپے

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ قَالُوا لَبِثْنَا
يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ

اللہ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے۔ وہ کہیں گے کہ ایک دن یا اس سے بھی کم ان لوگوں سے پوچھ جو شمار رکھتے تھے

دوسری آیت میں دس دن کا بھی ذکر ہے۔

يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا
يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا (۲۰-۱۰۵)

وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس دن۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ کہیں گے۔ جو سب سے زیادہ رو براہ ہوگا۔ وہ کہیگا کہ تم تو صرف ایک دن رہے

نتائج

ان تمام تفصیلات کے بعد ہم حسب ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں۔ جو قرآن کریم سے تصریحاً ثابت ہوتے۔

(۱) عالم برزخ عالم ممات ہے۔ جس میں نہ مُردوں میں شعور ہے نہ احساس۔ نہ علم نہ سمع، نہ حیات کا کوئی شائبہ!

(۲) انسان کے لئے دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں۔ پہلی زندگی یہ دنیوی زندگی ہے۔ اور دوسری زندگی حشر کے دن ملیگی۔ برزخ میں زندگی نہیں ہے۔

(۳) اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مرنے والے کے لئے موت ہی کا دن حشر کا دن ہے۔

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے برزخ میں عذاب یا ثواب کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں عذاب یا ثواب کا ذکر ہے۔ وہاں صرف دنیاوی اور اخروی عذاب و ثواب کا ذکر ہے۔ برزخ کا کہیں نام تک نہیں آیا ہے۔

سینکڑوں آیتیں مختلف قسم کے مجرموں کے عذاب کے متعلق ہیں۔ مگر کسی میں دنیا اور آخرت کے عذاب کے برزخ کے عذاب کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور ہو بھی کیسے جبکہ نہ برزخ میں حیات کا کوئی شائبہ ہے۔ نہ زمانہ عذاب ثواب سے اثر پذیری کی کوئی صلاحیت یہی وجہ ہے کہ بجز ان انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جن کی سزا یا جزا لازمی طور پر دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔ اور جن کی تصریح آیاتِ قرآنی میں کر دی گئی ہے۔ صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ دارالجزا آخرت ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۶ — ۶۱)

اور اگر اللہ لوگوں کا ان کے گناہوں پر مواخذہ کرنے لگتا۔ تو زمین میں کوئی جاندار نہ چھوڑتا۔ لیکن اس نے لوگوں کو ایک وقت مقررہ تک مہلت دے رکھی ہے۔

یہ "اجل مسمّٰی" کون سا دن ہے؟ اس کی تصریح کئی جگہ قرآن میں کر دی گئی ہے۔

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (۷۷ — ۱۲)

کس دن کے لئے مہلت دی گئی ہے فیصلہ کے دن کیلئے

Marfat.com

یہ فیصلہ کا دن قیامت کا دن ہے۔

وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا ھٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ۔ ھٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ
الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوْنَ (۲۷-۲۰)

اور کافر کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت! یہ انصاف کا دن ہے (ہاں) یہی
وہ فیصلہ کا دن ہے۔ جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

اس لئے دنیا کے بعد حساب وکتاب وعذاب کا دن قیامت کا دن ہے۔ برزخ نہیں ہے یہاں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ جس نے حضرت نوحؑ کا انکار کیا۔ وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے۔ اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔

اعتراضات کا جواب

قرآن کی رو سے دونوں کے فیصلہ کا ایک ہی دن مقرر ہے اسی دن ان کے اعمال نامے نکالے جائیں گے۔ اور حساب وکتاب ہوگا۔ اور جزا وسزا دی جائے گی۔ برزخ کے زمانے کا دونوں میں سے کسی کو احساس نہ ہوگا۔

اب میں ان چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں۔ جسے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ
ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲)

Marfat.com

جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (قرآن سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ تم جنت میں داخل ہو۔ ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت خاص دارآخرت کے متعلق ہے۔ برزخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا سلسلہ بیان یہ ہے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ - الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲)

اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے۔ اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا۔ ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں وہ داخل ہوں گے۔ جن کے نیچے بہتی نہریں ہوں گی ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے۔ ان کو وہ ملے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔ جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں جبکہ وہ پاک تھے۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ اپنے عمل کے بدلے جنت میں چلو

دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذاب برزخ کا خیال ہوتا ہے یہ ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ. اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ

Marfat.com

عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ
اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ

اور آلِ فرعون کو برے آگ کے عذاب نے گھیر لیا۔ جس پر وہ صبح و شام پیش کئے جائیں گے۔ اور قیامت کے دن کہا جائیگا کہ آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈالدو

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آل فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح اور شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ عذاب برزخ ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کردو۔

یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جو پہلے بدلائل بیان کردی گئی ہیں کیونکہ اگر برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح و شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور و احساس بھی ہونا چاہیئے۔ جن کا قرآن تصریحاً انکاری ہے۔ اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ دراصل ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ "یعرضون" کے معنی یہاں حال کے لئے گئے ہیں۔ یعنی وہ "پیش کئے جاتے ہیں" حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں۔ کیونکہ کفار جن میں آلِ فرعون بھی شامل ہیں۔ ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ
طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا (۴۶-۲۰)

Marfat.com

اور جس دن کفار آگ پر پیش کئے جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کہ

تم اپنی لذتیں دنیوی زندگی میں اٹھا چکے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ آگ پر پیشی دوسری زندگی میں ہوگی۔ جو حشر کے دن ملے گی چنانچہ سورۃ ہود میں اس کی تصریح موجود ہے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ (۱۱-۹۸)

فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئے گا۔ قیامت کے دن اور ان کو آگ میں اتارے گا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ بزخ کا غیر زمانی ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں۔ اس میں نہ صبح ہے نہ شام اور اس آیت میں غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بجنسہ اسی طرح جس طرح جنت کے لئے بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی مفسرین اور اہل لغت نے دوام کے لکھے ہیں۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹-۶۲)

اور جنتیوں کو ان کی روزی اس میں صبح و شام ملتی رہیگی

جو صبح اور شام جنت میں ہے۔ وہی دوزخ میں ہوگا۔ خواہ اس کے معنی دوام کے لئے جائیں یا کچھ اور۔ اب اس طرح آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنی آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب جو دیا جائے گا۔ وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

Marfat.com

وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ
هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۲۸-۴۲)

اور ہم نے اس دنیا میں آل فرعون کے پیچھے لعنت لگا دی۔ اور قیامت کے دن وہ برے حال میں ہوں گے۔

دنیا میں ان کے ملعون اور قیامت میں مقبوح ہونے کی تصریحات کی گئی ہیں۔ مگر برزخ کا نام نہیں لیا گیا۔

اصلیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جا بجا موت کے ساتھ ہی ساتھ عذاب یا ثواب کا جو ذکر آتا ہے وہ قیامت کے دن عذاب یا ثواب ہے۔ برزخ کا نہیں ہے کیونکہ موت اور قیامت میں مُردوں کے لحاظ سے فصل زمانی نہیں ہے۔ لوگوں کی نظر چونکہ اس نکتہ پر نہ تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے عام اعتقاد کے مطابق اس عذاب و ثواب کو موت کے بعد برزخ کا سمجھ لیا۔

جو حال آلِ فرعون کا ہے۔ بجنسہٖ وہی حال قوم نوحؑ کا ہے۔ یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کئے جائیں گے

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (۷۱-۲۵)

وہ غرق کئے گئے اور آگ میں داخل کئے گئے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں جنت کے ثواب اور جہنم کے عذاب کے متعلق جا بجا ماضی ہی کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔ کیونکہ اللہ جو زمانہ سے بری ہے۔ اس کے

Marfat.com

سامنے یہ سب واقعات حاضر ہیں. مثلاً حشر کے متعلق ہے

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا (۱۴ - ۲۱)

اور وہ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے۔ اور کمزوروں نے ان لوگوں سے
کہا جو بڑے بنتے تھے۔

یا جہنمیوں کے بارے میں ہے۔

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ (۲۲ - ۲۰)

جن لوگوں نے کفر کیا۔ ان کے لئے آگ کے کپڑے تراشے گئے۔

یا جنتیوں کے متعلق ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ
اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ (۳۷ - ۵۰)

جنتیوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے کہا کہ ایک
کہنے والے نے کہا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا۔

اس لئے قوم نوح کے متعلق جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ قیامت کے دن کے لئے
ہیں۔ کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب و کتاب اور عذاب و ثواب کے دن کی تصریح
کر دی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے۔ لہذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں۔

تیسری آیت جو برزخ کے عذاب کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ہے

وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ
وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ
وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ
الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا

(۹۴ — ۶)

اور تو دیکھتا رہا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں۔ اور فرشتے اپنا ہاتھ پھیلائے ہوتے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال دو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائیگا۔ اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے۔ اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے۔ جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا۔ اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔ اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے۔ جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمہارے امور میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔

اس آیت میں الیوم کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے۔ اور موت اور قیامت کے دن میں مُردوں کے لئے

سے فصیل نہیں۔ تو یہ آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں

اول مرۃ (جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا) کا لفظ اس تصریح کر رہا ہے۔ کہ یہ

حیاتِ اخروی کا واقعہ ہے۔ دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ حشر کی تصریح کر دیگئی

وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝ وَعُرِضُوْا

عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ

اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۸ - ۴۸)

اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے۔ اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے

اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے (اور ان سے

کہا جائے گا) کہ تم ہمارے پاس آئے۔ جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا

اس میں باوجود اس کے کہ سارے صیغے ماضی کے مستعمل ہوئے ہیں۔ تصریح کی گئی ہے۔ کہ یہ

سوال وجواب حشر کے دن کا ہے۔

الغرض قرآن کریم سے عذاب یا ثواب برزخ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ

حدیث کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "میرے

پاس مدینہ کی دو یہودی بڑھیا عورتیں آئیں۔ انھوں نے کہا کہ قبر میں مردوں پر عذاب ہوتا

ہے۔ میں نے ان کو جھٹلایا۔ جب وہ دونوں چلی گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

گھر میں تشریف لائے۔ تو یہ بات میں نے آپؐ سے ذکر کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں ان دونوں

عورتوں نے سچ کہا۔ مردوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ جس کو سارے چوپائے سنتے ہیں

Marfat.com

پھر اس کے بعد سے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلعم ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے۔" یعنی اس وقت تک رسول عظیمؐ عذاب قبر سے خالی الذہن تھے۔ ان یہودی عورتوں کے کہنے سے خیال پیدا ہو گیا

یہ اور اسی قسم کی حدیثیں ہیں۔ جن سے اس عقیدہ کی تخلیق ہوئی

چونکہ مستفسر نے صرف عذابِ قبر سے (یا عالمِ برزخ) کے متعلق ہی سوال کیا ہے اس لئے ہم نے جواب کو بھی اسی حد تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ اصل سوالات تو یہ ہیں۔ کہ قرآن کے تصورِ حیات کسے کہتے ہیں؟ موت کے کیا معنی ہیں؟ قیامت کا تصور کیا ہے؟ عذاب و ثواب سے کیا مفہوم ہے؟ جنت اور دوزخ سے کیا مقصود ہے؟ نجات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ وغیرہ ذالک۔ مسلمان کو چونکہ اس زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا (کہ زندگی سے واسطہ زندوں کو ہوا کرتا ہے۔ مردے کیا جانیں کہ زندگی کسے کہتے ہیں) اس لئے اس نے ان اہم سوالات کو قیامت پر ملتوی رکھا ہے۔ اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئے گی۔ وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا

قیامتِ موجود چاہتا۔ جو اس کی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے۔ اور اس جنت و دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے جس میں قوموں کے اعمالِ حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اس عذاب و ثواب پر نگاہ رکھتا ہے۔ جو اس کی زندگی کے ہر ثانیہ کو متاثر کئے جا رہا ہے

Marfat.com

یہ ہیں وہ سوالات جو زندگی کے حقائق سے متعلق ہیں۔ لیکن مسلمان حقائق کا سامنا کبھی نہیں کرنا چاہتا کہ ان حقائق کے آئینہ میں اسے اپنی تصویر ایسی بھیانک دکھائی دیتی ہے جس سے اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ اسی لئے اسی میں عافیت سمجھ رکھی ہے کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ گویا آنکھیں بند کر لینے سے حقائق معدوم ہو جائیں گے۔

بہر حال یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ مردوں میں نہ شعور ہوتا ہے۔ نہ احساس۔ نہ وہ ہماری سنتے ہیں نہ اس کا کچھ علم رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمان نے زیریں زمین ایک دنیا بسا رکھی ہے۔ اور اس موجودہ دنیا کا سارا نظم و نسق زیر زمین مردوں کے سپرد کر رکھا ہے ساری دنیا "مردہ بدست زندہ" کی قائل ہے۔ لیکن مسلمانوں **مردہ بدست زندہ** کے نزدیک تمام زندہ انسان مردوں کے بس میں ہیں۔ یہی مردے (غوث، قطب، ابدال، اولیا وغیرہ) نظام عالم کے مختار کار ہیں اور حکمرانِ قضا وقدر کے مالک۔ جب زندہ انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے۔ تو وہ ان مردوں سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ وہ ان کے حضور جا کر روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ فریاد کرتا ہے۔ ان سے داد رسی چاہتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ مردے اس کی تقدیریں بدل دیں گے۔ غور کیجئے کہ جو انسان اپنی تقدیریں مردوں سے بدلوائیں۔ ان سے بڑھ کر ذلت کی اور پستی طاری ہو سکتی ہے۔ فطرت انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آگاہ کرتی ہے کہ تمہاری کیوں مت ماری گئی ہے۔ لیکن یہ (بظاہر) زندہ (درحقیقت) ایسے مردہ ہیں کہ انہیں فطرت کی تنذیر سے بھی آگہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ بڑی بڑی درگاہیں

Marfat.com

اور خانقاہیں۔ جنھیں یہ اپنے عقیدہ میں تمام قوتوں کا مرکز سمجھا کرتے تھے۔ اور اپنی تمام امیدیں کا ملجا و ماویٰ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں کس بری طرح سے پامال ہو رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ قبریں نہ صرف یہ کہ اپنے معتقد بندہ ہی کی حفاظت نہ کر سکیں۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی نہ بچا سکیں۔ آج ان سب درگاہوں پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ ہے۔ اور وہ انھیں جس طرح جی چاہے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان کی آنکھ میں ذرا بھی روشنی ہوتی تو وہ دیکھتا کہ جنھیں میں اتنی بڑی قوتوں کا مالک سمجھتا تھا۔ وہ کس قدر بے بس نکلے لیکن اس کی آنکھوں میں نور بصیرت کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی۔ اس نے ان قبروں کے تھن یہاں بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ اور اب ان کے حضور سجدہ ریزی ہونے لگ گئی ہے۔

کوئی پتھر ہو مطلب تو سر پھوڑنے سے ہے!
نماند ناز شیریں بے خریدار!
اگر خسرو نباشد، کوہکن است

Marfat.com

اِنسانی اِرتقار

نظریۂ ارتقار سے متعلق میرا مضمون (مطبوعہ طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۱ء) پڑھنے کے بعد ایک صاحب نے لکھا ہے۔

"آپ نے لکھا ہے کہ انسان سلسلۂ ارتقار کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقار کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (Cause) سے ایک معلول Effect پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلۂ علت و معلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی ارتقار (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ مادہ پرست یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ارتقار مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقار بھی مادی ہی ہونا چاہیئے۔ کیا صراط مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی سب خط پر اس وقت تک ارتقار ہوتا چلا آیا ہے۔ اس پر آگے ارتقار ہو؟"

پرویز صاحب کا جواب۔

آپ نے غالباً قانون ارتقائے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا اصول یہی نہیں کہ ایک علت سے اس قسم کا معلول پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ قانون نظریۂ ارتقار کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ بعد میں سائنس کی تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علّت Cause اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول Effect تک جا پہنچتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل انوکھا اور بیحد غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا نام فجائی ارتقار Emergent Evolution رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے بیج سے الگ الگ قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں اصطلاح میں Sports کہتے ہیں۔ یہ واقعہ بڑا نادر الوقوع ہوتا ہے۔ اس لئے ارباب علم و تحقیق اس قسم کے Sports کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک نطین یا نابغہ Genius کی پیدائش اسی قسم کے Sports میں شمار کی گئی ہے۔ چنانچہ اس باب میں Hogben لکھتا ہے۔

بیس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو Mutants یا

Marfat.com

Sports کہتے ہیں۔

The Naturo Of Living Matter

اس قسم کے ارتقار سے جو چیز وجود میں آتی ہے وہ اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنس کی تحقیقات نے ایسی اشیار کی تخلیق اور وجود کا پتہ تو لگا لیا ہے لیکن اس کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکی ہے کہ یہ ہوتا کیسے ہے چنانچہ پروفیسر Taylor اس باب میں لکھتا ہے :۔

ان تمام اسباب وعلل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے۔ ہر ممکن حساب کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نشوونما کے بعد یہ شے ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے۔ جو ان عناصر میں کہیں بھی موجود نہ ہوں جن سے یہ شے مرکب تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

Evolution In The Light Of

Modern Knowledge

Emergent Evolution ہمارے زمانے میں اس نرالی ارتقار کا سب سے بڑا امام لائیڈ مارگن ہے۔ وہ اپنی کتاب میں (جو اسی نام پر ہے) لکھتا ہے۔

Marfat.com

Emergent اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم
کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم
کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے
نئے ہوتے ہیں۔ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق
ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
یہ نئے روابط کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق وائی کونٹ ہیمبوئیل کہتا ہے کہ
علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات ملتے ہیں جنھیں
صرف دست قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔

فجائی ارتقار کا نظریہ عصر حاضر کے اہم انکشافات میں سے ہے۔ اور اس کے متعلق شرح و
بسط سے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن ان مختصر سے اشارات سے
اتنی بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ قانون ارتقار صرف وہی نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے
اس میں "فجائی ارتقار" بھی شامل ہے۔ جس کی رو سے

ایک نئے عنصر کا ظہور

علت و معلول میں بعض اوقات ایسے غیر متوقع عناصر
ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ جن کی تخلیق کے متعلق سائنس کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیسے ظہور میں
آ گئے۔ یہ عناصر سلسلہ علت و معلول کی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس
تمہید کی روشنی میں انسانی سلسلۂ تحقیق کو دیکھئے۔ پیچھے سے سلسلہ طبیعی ارتقار چلا آ رہا
ہے بدا خلق الانسان من طین۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا جامد مادہ سے

Marfat.com

ہوئی) ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین (پھر یہ مختلف ارتقائی منازل کے بعد اس درجے میں پہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ حمل ہوتی ہے) یہاں تک عام ارتقائی قانونی کڑیاں چلی آرہی تھیں۔ اس کے بعد یکایک ایک اور منزل سامنے آجاتی ہے۔ جو گزشتہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ یعنی ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ (پھر اس میں اعتدال پیدا کیا۔ اور اس میں خدائی قوت کا عنصر پھونک دیا) یہ بطریق فجائی ارتقاء ہوا۔ اب یہ "تو" Thou[1] کہہ کر پکارنے کے قابل ہوگیا۔ کیونکہ اس میں انسانی خصوصیات کے حامل ذرائع علم و تصور Knowledge and Imagination پیدا ہوگئے۔

وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ (اور تمہارے لئے سماعت، بصارت اور قلب بنایا)۔ یہ "ونفخ من روحہ" (خدائی قوت کا کرشمہ) وہ نیا عنصر یا نیا رابطہ ہے جو سابقہ عناصر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید اور نرالا اضافہ ہے۔ یہی انسانیت کا امتیاز خصوصی ہے۔ اسی سے انسان صاحب اختیار و ارادہ بنا ہے اور اسی سے اس قابل کہ یہ مجرد زمان و مکان Abstract Time and Space کا احساس کرسکے اس کے بعد اس کی ارتقاء کا خط Line وہ نئی پٹڑی ہوگی جسے "نفخ من روحہ"

---

[1] اس کا تخاطب کن انسانی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لئے Buber کی کتاب I And Thou دیکھئے

Marfat.com

نے متعین کیا ہے۔ یعنی انسان کی موجودہ سطح دو حصوں کا مرکب ہے۔ ایک خالص طبیعی ارتقار کا نتیجہ۔ جسے اس کا طبیعی جسم کہنا چاہئے۔ اس کی نشوونما اسی قانون کے مطابق ہوگی جو حیوانی زندگی کو محیط ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو "نفخ روح" (خدائی قوت کی تنفیخ) سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جسے انسان کی مضمر صلاحیتیں کہا جاتا ہے (حصہ اول یعنی جسم) درحقیقت ان صلاحیتوں کا مرکب یا ذریعۂ شہود (پیکر) ہے۔ اس لئے اصل انسانیت یہی صلاحیتیں ہیں۔ اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے کہ ان خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی ارادہ و اختیار ہے۔ اور جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ) اب اس کی ارتقار ان صلاحیتوں

ارتقار کی اگلی منزل

کے ارتقار کا نام ہوگا۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے۔

انسانیت کے ارتقار کی اگلی منزل طبیعی نہیں۔ بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی پہلے پہل انسان ارتقار کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقار نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجے میں قدم

Marfat.com

رکھے. پھر اسکی جبلّی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے
اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا. اسی طرح وہ آج مجبور ہے. کہ اپنا
قدم آگے بڑھائے. اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور
نفسی ترقی کی طرف ہوگا.

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقار نہیں بلکہ ان کے ساتھ انسانی ذات
Personality کا وہ ارتقار بھی. جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کرے
کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے اس لئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقار
کا راز تمام افراد انسانیہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے (اسی کا نام ربوبیت
عامہ ہے. جس کی طرف میں شروع سے دعوت دیتا چلا آرہا ہوں اور جو قرآنی
تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے) اس قسم کے جامع ارتقار کو (کسی اور موزوں اصطلاح نہ
ہونے کی وجہ سے) "ارتقائے انسانیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے
قرآن نے اس کے لئے "تزکیۂ نفس" کی اصطلاح استعمال کی ہے. لیکن چونکہ تصورات
عجم کی بدولت اس اصطلاح کا عام مفہوم یکسر غیر قرآنی ہو چکا ہے. اس لئے اس اصطلاح
کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہیئے. جب تک یہ پھر قرآنی مفہوم کی آئینہ دار

۱؎ Realisation, Growth and Development of Nafs (Self یہ ہیں تزکیۂ نفس کے معانی)

Marfat.com

نہ بن جاتے۔ بہرحال اب انسانی ارتقار اس جدید خط پر ہوگا۔ اور چونکہ قرآن کی رو سے زندگی صرف یہی طبعی زندگی نہیں۔ اس لئے اس ارتقار کی منازل موت کے بعد بھی طے ہوتی رہیں گی۔

قرآن کا حرکیاتی تصوّر

آپ نے "صراط مستقیم" سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ قرآن سے پہلے ذہن انسانی زندگی کی دَوری حرکت کا قائل تھا۔ جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا قرآن نے زندگی کا حرکیاتی Dynamic تصور پیش کرکے یہ بتایا کہ حیات، کسی چکر Cycle میں گردش نہیں کر رہی۔ بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی Progressive ہے "صراط مستقیم" سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہوگیا۔ پھر چونکہ "مستقیم" میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لئے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی، مختلف قوتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ "صراط مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے۔ اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو

کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے لترکبن طبقاً عن طبق (۸۴/۱۹) تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ۔ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتادیا کہ صراط مستقیم تمہارے اس نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے۔ جو ذی معارج (۷۰/۳) ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے (ارتقائی کرتے ہوئے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ۔ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموت والارض (۵۵/۳۳) یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ارتقاء اس نظام ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے۔ جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام انسانی میں۔ مانند اپنی خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے۔ جن خطوط پر خارجی کائنات خدائی قوانین کے ماتحت طوعاً و کرہاً سجدہ ریز اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے۔ یعنی خارجی کائنات طوعاً و کرہاً مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے۔ لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروگرام کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک دوسرے کے رفیق۔

بقول علامہ اقبال

اس ارتقائی تبدیلی کے طریق و نہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس باب میں عمل کرے۔ ان اللہ لا یغیر

Marfat.com

ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم لیکن اگر وہ اس باب میں
پہل نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خوری کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔
اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا۔ تو
اس کی روح پتھر کی فطرت اختیار کر لیتی ہے اور (وہ انسان نہیں
رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیل جدید)

پنجرنگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس ڈریش Hansdriesh
اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ وہاں پہونچکر "ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں!
قرآن اس جماعت کو "حزب اللہ" کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ "حزب اللہ" وہ معاشرہ
ہے۔ جو قرآنی نظام ربوبیت کی رو سے تشکل ہوتا ہے۔

قوتِ فیصلہ جس چیز کا نام ہم نے "نفخ روح خداوندی" کا نتیجہ رکھا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ اس کی خصوصیات کبریٰ کیا ہیں؟ قرآن نے اس فجائی ارتقاء کے بعد فرمایا ہے کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فؤاد مل گئے ہیں۔ سماعت اور بصارت وغیرہ حواس۔ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معلومات انسان کی داخلی دنیا میں ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہیں۔ جہاں سے مختلف امور کے فیصلہ ہوتے ہیں "فیصلہ کرنے" کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جبلّی تقاضوں Instinct کی رو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات Possibilities آتے ہیں۔ ان ممکنات

میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ لہذا "فواد" کا کام انسانی اختیار و ارادہ کا استعمال ہے۔ یہی بنیادی خصوصیت ہے۔ جو انسان کو حاصل ہے

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے "اندر" پہونچاتا ہے اور پھر "اندر" سے جو فیصلہ صادر ہو اس پر عمل کرے۔ اس کے برعکس حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے انسانی جسم کے ہوتے ہیں۔ (جنھیں خواہشات کہا جاتا ہے)۔ اور "اندر" کے فیصلہ کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی۔ جس میں جسم کے تقاضے جبلّی طور پر Instinctively پورے ہوتے رہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ دوسرے انسانی سطح کی زندگی جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو۔ اور جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کے لئے آلہ اور ذریعہ کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین قسمیں ہو جائینگی۔

(۱) جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں۔ نہ قوتِ فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف۔ حیوانی سطح سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔

(۲) جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں۔ لیکن نفس انسانی (اختیار و ارادہ) کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔

(۳) جس میں جسم انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں۔ اور اس کے ساتھ

Marfat.com

ہی انسانی اختیارات کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن یہی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت و تقویت بخشتا ہے۔ عمل خیر کہلاتا ہے (خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے) لیکن چونکہ اختیار و ارادہ تخریبی مقاصد کے لئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کے لئے بھی۔ اس لئے وہ اختیار و ارادہ کے استعمال کے لئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے تاکہ ہر معاشرہ کا ہر اختیار تعمیری نتائج کا حامل ہو۔ تخریبی کا نہ ہو۔ یہ میزان ضابطۂ آئین خداوندی (قرآن) ہے۔

قرآنی معاشرہ

لہٰذا جس معاشرے میں۔

(ا) انسانی جسم کے تقاضے بطریق احسن پورے ہوتے رہیں۔

(ب) انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع ہوتے رہیں اور

(ج) انسانی اختیارات کا استعمال وحی کی روشنی میں ہو۔

وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھے گی۔ اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی۔ (وسخرلکم مافی السموٰت والارض جمیعاً) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبیعی) دنیا سے متعلق ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی۔ یعنی جسم کا کام انسانی قوت فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا۔ اور اس کے فیصلوں کو جاری رکھنا ہوگا۔ اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائیگی۔ اسی قدر انسانی زندگی ابدیت

Marfat.com

Inmortality سے ہمکنار ہوتی جائیگی. جب جسمانی نظام طبعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں). تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے۔ اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا ادارہ مل جائے گا۔

اس قوت کی پختگی اور وسعت صرف اس نظام میں ہو سکتی ہے. جسے نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے اختیار

نظام ربوبیت

ارادہ سے دوسروں کی پرورش اور تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں. لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا انتظام از خود موجود ہے۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے۔ ہر فرد کی تمام بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے۔ اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے ماحصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے۔ وہ معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی پکتی ہے (ھم المفلحون) جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں۔ یہی ہیں. وہ جو سلسلۂ ارتقا کی اگلی منزلوں میں پہونچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان۔ نہ اس طبعی ارتقا کی آخری کڑی ہے (بلکہ اس کی "انسانیت" طبعی ارتقا کے سلسلۂ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقا طبعی ہوگا۔ طبعی ارتقا کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے

Marfat.com

اس میں جوہر انسانیت غیر طبیعی ہے۔ جسم انسانی اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کے لئے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا آلہ یا واسطہ ہے۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ اس غیر طبیعی جوہر انسانیت کا ہوگا جسے ہم موت کہتے ہیں وہ درحقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی اختیار وارادہ) کی نشوونما ارتقاء قرآنی نظام ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار وارادے کی قوتیں (قرآنی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کئے جاتی ہیں۔ نہ کہ وہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے۔ وہ موت سے نہیں مر سکتا۔ اسی کا نام سلسلۂ ارتقا کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔

سوچئے کہ ہم میں آج کتنے زندہ ہیں؟

(س) آدم

ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے انسان سلسلۂ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا اس شکل میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدم سے کیا مراد ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہم سب بابا آدم اور اماں حوا کی اولاد ہیں۔ یعنی انسان کے ایک جوڑے سے ساری نسل آگے چلی ہے۔

جواب۔

آدم کے متعلق میں تفصیل سے معارف القرآن کی دوسری جلد میں لکھ چکا ہوں وہاں سے معلوم ہوگا کہ قرآن کے بیان فرمودہ قصۂ آدم میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد نوع انسانی کا نمائندہ Representative of Mankind ہے اور وہ قصہ کسی ایک شخص کی سرگزشت نہیں۔ بلکہ انسانی زندگی کے ماجرہات وکیفیات کی تمثیلی داستان ہے۔
(تفصیل محولہ بالا کتاب میں ملے گی)

Marfat.com

قومی ملکیت

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ طلوعِ اسلام اس نظریہ کا داعی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلامی معاشرہ کی مکمل شکل اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب زمین اور دیگر ذرائع پیداوار اجتماعی نظام کی تحویل میں دیدیئے جائیں اور وہ تمام افراد مملکت کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اس کے برعکس سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب مسئلہ ملکیت زمین میں اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنالینے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھدینا چاہیئے۔ جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ۔ اصل یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف

Marfat.com

آتی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمراں گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انھیں ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جائے پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے۔ تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو افراد کی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا استیصال کرنا ہے۔ نہ کہ

اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

یعنی ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے۔ جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ ہم حیران ہیں کہ ہم اسے کیا سمجھیں کیا آپ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں گے ؟

جواب۔

ہم نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ مودودی صاحب کے حواریوں میں سے ایک ایک صاحب نے ان کی شان میں یہ فرمایا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتے ہیں۔ لہذا جس کی پوزیشن یہ ہو وہ اگر ہر اس نظام اور نظریہ کو جو ان کی مصلحت کوشیوں سے ٹکراتا ہو سب سے بڑا انسانیت کش شیطانی نظام قرار دیں تو اس سے کم اور کیا کہیں۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو الجھ کے گورکھ دھندے میں الجھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ ان کی کتابوں کو دیکھئے۔ بات سیدھے سادے طور پر ایک صفحے میں کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس کے متعلق بیسیوں صفحات لکھتے چلے جائیں گے۔ اور پھر بھی بات صاف نہیں ہونے پاتے گی۔ اور

Marfat.com

بیس صفحات میں وہ بڑے بڑے ائمہ اور ان کی بڑی بڑی تصانیف کا ذکر بار بار کرتے چلے جائیں گے تاکہ عام نوجوان طبقہ اس سے مرعوب ہو جائے۔ قومی ملکیت کے مسئلہ پر جو کچھ طلوع اسلام میں آیا ہے۔ اس کے متعلق قرآنی دلائل دیئے گئے تھے۔ مودودی صاحب نے اپنے اس فتویٰ میں کسی قرآنی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ باقی رہی ان کی وہ ادیبانہ دلیل۔ جو انہوں نے اس اقتباس میں پیش کی ہے۔ سو وہ تلبیس حق و باطل کی ایک بڑی دلچسپ مثال ہے۔ سوال پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی نظام معاشرت و تمدن میں ذرائع پیداوار مرکزی تحویل میں دیئے جائیں گے یا افراد کے پاس رکھے جائیں گے۔ یہ حقیقت واضح ہے اور خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آ رہی ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین متشرع، متقی، پرہیزگار، خدا ترس یعنی بہمہ وجوہ خدا اور رسول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ حکومت کو علیٰ منہاج نبوت و منہاج خلافت راشدہ قائم کریں گے۔ اب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار کو نظام کی تحویل میں دیدیا جائے تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بنکر رہ جائیگی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون ساری کی طاقتیں ہوں گی انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانداری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا۔ جس سے بڑھ کر

Marfat.com

انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں ——

(۱) یورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر مکراں گروہ کے ہاتھ میں آجائے گا

(۲) ملت اس حکمران گروہ کی غلام ہوگی

(۳) اس حکمراں گروہ کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی جو وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لئے استعمال کر سکیں گے

لہٰذا

(۴) سوداگری کارخنداری اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھوں میں آگئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت ذبح ہو جائے گی۔

اگر اسلامی نظام حکومت کے ارباب حل وعقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ اگر ان کے ہاتھ میں رزق کے سرچشمے چلے گئے۔ تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ تو فرمایئے کہ ایک فرعونی نظام اور ایک اسلامی نظام میں پھر فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے۔ تو پھر اس اسلامی نظام میں کیا خوبیاں ہیں جن کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کی ہر کوشش کا نام جہاد رکھا جاتا ہے؟ اگر اسلامی نظام میں بھی بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کا محکوم بننا ہے۔ اگر اس میں بھی پولیس، فوج، عدالت اور قانون سازی کی طاقتوں نے حکمراں گروہ کے مفاد ہی کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر انھوں نے بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بنکر بیٹھ جانا ہے۔ تو پھر موجودہ نظاموں میں کونسی خ

ہے کہ اس نظام میں نہیں ہوگی۔ پھر یہ اتنا بڑا دھوکہ دنیا کو کیوں دیا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی زبان اور قلم سے غیر شعوری طور پر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اس کے قلبی پس منظر کی صحیح صحیح ترجمانی کر دیتی ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے اور اس کا نام اسلامی نظام حکومت کا قیام قرار دیتی ہے۔ چونکہ ان کی اس آرزو کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہے جو دوسرے ہوس پرستوں کا ہوتا ہے اس لئے ان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقشہ بھی وہی ہوتا ہے جو ہر لٹیروں کی جماعت کا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر مودودی صاحب نے قومی ملکیت کو شیطانی نظام قرار دیا ہے۔ یعنی بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے اور اس مسئلہ کے خلاف خرابیاں وہ گنا رہے ہیں جن کا موجودہ غیر اسلامی نظام حکومت میں پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ہم پوچھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے شام اور عراق اور دیگر مفتوح ممالک کی زمینوں کے متعلق یہ انتظام فرمایا تھا کہ انہیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتاً نظام حکومت کرے تو کیا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) شیطان کی ایجاد تھا؟ اور کیا اس انتظام سے وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئی تھیں جنہیں مودودی صاحب اس نظام کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔؟

Marfat.com

اس تصور کے خلاف کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "مسئلہ ملکیت زمین" میں ایک عجیب طنزیہ تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

آج کل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک اور نقطہ یوں نکالا ہے۔ "الارض للہ" اور انھوں نے اس پر قیاس کا ایک پورا کریمنن تعمیر کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں :۔

اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہدیا ہے کہ للہ ما فی السموٰت وما فی الارض (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے)

قطع نظر اس کے کہ الارض للہ زمین کی کلی ملکیت کی تائید میں کوئی اہم دلیل بن سکتی ہے یا نہیں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں اور اسی قسم کی دوسری آیات کا مفہوم جب ان کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے تو اسے مردود قرار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی جماعت کے تمام دعاوی کا مدار اس اصولی دعوے پر ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لئے ہے۔ کسی فرد کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اور "خدا کی حکومت"

سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو (بقول ان کے) خدا کی نیابت کے طور پر اس کی منشاء کے مطابق حکومت چلائیں۔ اس دعوے کی بنیاد الحکم للہ (ان الحکم الا للہ) ہے۔ یعنی "خدا کی حکومت" اب ذرا سوچئے کہ مودودی صاحب نے الحکم للہ سے قیاسات کا یہ سارا کرملین اپنے حق میں تعمیر کر لیا کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں پہونچتا بلکہ اس کا حق ملت کو پہونچتا ہے جو منشائے خداوندی کے مطابق حکومت چلائے۔ یعنی ان کے نزدیک الحکم للہ سے یہ قیاس بالکل منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص الارض للہ سے بعینہٖ اس قسم کا مفہوم لے یعنی وہ کہے کہ زمین پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ملت کی ملکیت ہے۔ اور ملت ہی کو حق پہونچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق اس کا انتظام کرے۔ تو مودودی صاحب کے نزدیک یہ من مانی تاویل بن جاتی ہے۔ یعنی الحکم للہ کی وہی تاویل عین قرآنی ہے۔ اور الارض للہ کی اس قسم کی تاویل من مانی ہے۔ الارض للہ کے خلاف مودودی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ بھی آیا ہے کہ للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے الحکم للہ کے ضمن میں بھی تو قرآن میں یہ آیا ہے۔ کہ ملکوت کل شئ خدا کے لئے ہے اور ملکوت السمٰوٰت والارض اسی کے لئے ہے۔

یعنی مودودی صاحب چونکہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، اس لئے الحکم للہ کی تفسیر اس امر کی تائید کرتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے حامیوں کی زمینداریاں

Marfat.com

اور جاگیرداریاں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے الارض للہ کی اسی قسم کی تفسیر انھیں من مانی دکھائی دیتی ہے۔

یہ ہے نمونہ ان لوگوں کا جو اس طرح نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدان سیاست میں آرہے ہیں کہ

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

مودودی صاحب نے بڑے طعن آمیز انداز میں فرمایا ہے کہ اس طرح تو مرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو کچھ زمین آسمان میں ہے، اللہ کا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ میاں بیٹھے بیٹھے یونہی شاعری کرتے رہتے ہیں اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے سچ مچ نہیں سمجھ لینا چاہیئے انھیں کون سمجھائے کہ قرآن میں اللہ نے شاعری نہیں کی ہے۔ جو کچھ کہا ہے سچ مچ ٹھیک کہا ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں" افراد کی ملکیت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں افراد کا فریضہ زندگی نوع انسانی کی ربوبیت (نشو ونما) ہوتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں ان کی اپنی ربوبیت بھی شامل ہوتی ہے۔ ان کی ربوبیت کے لئے کچھ چیزیں ان کے تصرف میں بھی دیدی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس آئین وضابطہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے اصولِ کلی کی روشنی میں مدون کئے جاتے ہیں۔ یہ ایک بالکل نیا تصور تھا۔ جو قرآن نے مملکتی نظام کے ضمن میں پیش کیا۔ ورنہ

Marfat.com

مملکتی نظام میں معدلت گستری زیادہ سے زیادہ اسی کو سمجھا جاتا تھا کہ مملکت ایک ایسا انتظام کرے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ملکیت کو غصب نہ کرنے پائے۔ یعنی مملکت کا کام افراد کے حق ملکیت کا تحفظ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ تصور پیش کیا کہ مملکت کا کام نوع انسانی کی ربوبیت کا انتظام کرنا ہے اور اس کے لئے ایسا نظم ونسق قائم کرنا ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے کے سامانِ ربوبیت کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے بلکہ اس ربوبیت عامہ کا ذریعہ بنے۔ یہ تھا وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ اور جو دنیائے ہرتسم کے تصور سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا مسلمانوں کے دور ملوکیت نے اس تصور کو الٹ کر پھر وہی پرانا سرمایہ دارانہ تصور قائم کر دیا اور یہی وہ دور ملوکیت کا تصور ہے جسے مذہب پرست طبقہ (جس میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے) عملاً نافذ کرنا چاہتا ہے خدا مسلمانوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھے۔

---

(۳۵) انتظام یوسفیؑ ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جب مصر میں قحط پڑا۔ تو حضرت یوسفؑ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ آپ اس مقصد کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائے تھے۔ کیا اس کی تفصیل کہیں سے مل سکتی ہے!

جواب۔

Marfat.com

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لئے شعبۂ مالیات (منسٹری آف فنانس) میری تحویل میں دیدو اس لئے کہ اُن حفیظ علیم ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ روپے کو کس طرح حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ملک کی غلہ کی گرانی کو دور کرنے کے لئے کیا طریق عمل اختیار کیا۔ اس کی تفصیل تورات میں ملتی ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۴۷ میں اس تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا۔ جمع کی۔ اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی۔ تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چُک گئی یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو۔ اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں دوں گا۔ دملپنے چوپائے یوسفؑ کے لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان کے سب

Marfat.com

چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہماری چوپاؤں کے گلے بھی لے لئے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے۔ اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو بہت تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انھیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انھیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لئے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے۔ کھیت میں بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ

Marfat.com

فرعون کو دے گے۔ اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک
اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے
ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کی نظر
میں مورد رحم ہوں۔ اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے۔ اور یوسفؑ
نے ساری مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ
فرعون پانچواں حصہ لے گا۔ مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام متروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انھیں آسانیاں بہم پہونچا دیں۔ تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے حاصل کے آپ مالک تھے۔ صرف پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشت کار کی محنت کے حاصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح سے حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا۔ جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں۔

Marfat.com

(س) انفرادی مفاد پرستی Individual Enterprise

کراچی سے ایک طالب علم کا سوال ہے۔
کیا قرآنی نظام میں انفرادی مفاد کی گنجائش ہوگی؟

جواب۔

"انفرادی مفاد" سے مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص، ذاتی سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرے اور اس کاروبار کے منافع کا مالک سمجھا جائے۔ اس سوال کے جواب کے لئے روپیہ کے متعلق قرآن کا نظریہ سامنے رکھیئے بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔

قرآن کی رو سے

(الف) زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لئے فاضلہ روپے سے زمین نہیں خریدی جا سکتی۔

(ب) جب زمین نہیں خریدی جا سکتی تو ظاہر ہے جائیداد کی غرض سے بھی مکانات نہیں بنائے جا سکتے۔ قرآن کی رو سے معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ تمام افراد کے لئے سکنی مکانات مہیا کرے۔ اس لحاظ سے بھی مکانات کرایہ پر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ج) روپیہ کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کی رو سے چاندی اور سونے کا اکتناز منع ہے۔ اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے لئے بڑی تہدید آئی ہے۔

(د) کوئی شخص بلا ضرورت روپیہ خرچ نہیں کر سکتا اسے تبذیر کہتے ہیں جس کی قرآن

میں سخت ممانعت ہے۔

(۸) نہ ہی کوئی شخص ضرورت سے زیادہ خرچ کر سکتا ہے۔ اسے اسراف کہتے ہیں اور قرآن کی رو سے اسراف بھی منع ہے۔

اب فرمایئے کہ ایک شخص ذاتی کاروبار سے منافع حاصل کر کے اس روپیہ کو کرے گا کیا۔ وہ روپیہ تو اس کے لئے وبال جان ہو جائے گا۔ اس کے پاس اس روپیہ کو رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ وہ نہ تو اسے جمع رکھ سکے گا۔ نہ خرچ کر سکے گا۔

اندریں حالات قرآنی نظام میں Individual Enterprise کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری آ چکی تھی اگرچہ اس دور کے مفاد پرستانہ استبداد نے عہد رسالت مآبؐ کے صحیح واقعات ہم تک پہونچنے نہیں دیئے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی کرن نظر آ جاتی ہے کہ اس دور میں روپیہ پاس رکھنے کا تصور تک بھی نہیں آتا تھا۔ خود رسول اللہ صلعم کے متعلق اس قسم کے واقعات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ آتا تھا۔ آپ اسے رات سے پہلے پہلے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند لمحات پہلے آپ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھ لیا کہ گھر میں کوئی روپیہ تو نہیں رکھا۔ جو چند درہم موجود تھے جب تک انہیں بھی ضرورت عامہ کے لئے نہیں دیدیا اطمینان نہیں ہوا۔ کتب تاریخ میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی باقی رہ گیا ہے کہ انبیاء کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی یعنی ان

کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربو بیت عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں کتب روایات میں موجود ہیں لیکن ہمارا ملّا رسول اللہ کی اس سنت کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتا۔ وہ صرف یہی بتاتا ہے کہ میٹھا کھانا سنت ہے یا اس قسم کی روایات بیان کرتا ہے کہ حضرت عثمان کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس مال و متاع کے لدے ہوتے اتنے اونٹ تھے ایسا بیان کرنے میں وہ کبھی نہیں سوچتا کہ ایک طرف تو صحابہ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ رسول اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے (جو رنگ درحقیقت قرآن کا رنگ ہے) اور دوسری طرف وہ یہ بتاتا ہے کہ روپے پیسے کے معاملہ میں رسول اللہؐ کا عمل وہ تھا اور ان صحابہ کا عمل یہ۔ ہمارے نزدیک رسول اللہؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے عمل کے پرکھنے کا صحیح معیار قرآن ہے۔ کتب روایات میں ان بزرگوں کی طرف جس قدر ایسے واقعات منسوب کئے گئے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ سب وضعی ہیں اور اس ملوکیت اور سرمایہ داری کے دور کی پیداوار ہیں جسے اپنی زراندوزی اور جاگیرداری کے نظام کے لئے اس قسم کی سندات کی ضرورت تھی۔

(س) مہاجرین کا مسئلہ

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (جون ۱۹۵۰ء) میں مہاجرین کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا۔ اس کے متعلق ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے اس سے کسی حساس قلب کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے اس ضمن میں مشورہ دیا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں بسنا ہے۔ تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان قومی رہنماؤں کو ہندوستان واپس بھیجا جائے۔ جو وہاں کے مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان با اثر لوگوں کے وہاں چلے جانے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھ جائے گی۔ لیکن یہ توقع کرنا کہ یہ لوگ یہاں کی آسائشیں چھوڑ کر وہاں کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کے لئے ہندوستان واپس چلے جائیں گے ایک خیال خام ہے۔ اگر انھیں اپنی ذمہ داریوں کا ایسا ہی احساس ہوتا تو یہ ہندوستان چھوڑتے ہی کیوں؟ اس لئے یہ علاج ناقابل عمل رہے گا

(۱۱) دوسرا علاج آپ نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہاں کے قائدین وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں۔ تو پھر وہاں کے مسلمانوں پر پاکستان کے دروازے بند نہ کئے جائیں۔ تاکہ وہ اور سب کچھ لٹا کر کم از کم اپنی جان اور آبرو کی حفاظت تو کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں بے بسی اور بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دینا ان

پر انتہائی ظلم ہے۔ لیکن پاکستان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کو اپنے یہاں آباد کرلے گا۔ اس لئے یہ طریق علاج بھی ناقابل عمل دکھائی دیتا ہے۔

اندریں حالات ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرلیا جائے اور اس کے بعد اس مشکل کا کوئی ایسا حل تجویز کیا جائے جو موثر بھی ہو اور قابل عمل بھی۔

جواب۔

ہم نے مہاجرین کے مسئلہ کے متعلق ماہ جون کی اشاعت میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ درحقیقت صورتِ حالات کا منطقی تجزیہ تھا اس معاہدہ کی روشنی میں جو اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان طے پایا ہے۔ ورنہ ہمارا ذاتی خیال تک ہے ہم اس سے پہلے کئی بار دہرا چکے ہیں اور اب بھی اسی خیال پر قائم ہیں کہ ہمیں فی الواقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا کوئی حل تلاش کرنا ہے تو وہ اول و آخر تبادلہ آبادی کی ہی صورت میں ہو سکیگا۔ اس کے سوائے کوئی دوسری صورت اس مشکل کا حل پیش نہ کر سکیگی۔ ہم اشیاء کا مبادلہ کاغذی معاہدوں سے طے کر سکتے ہیں لیکن انسانوں کا معاملہ قلبی معاہدوں کے بغیر نہ کبھی طے پایا ہے اور نہ طے پائے گا۔ قلوب کی تسخیر کسی قوم کے فلسفۂ زندگی سے متشکل ہوتی ہے۔ ہندو قوم کا فلسفۂ زندگی ہمارے سامنے ہے۔ وہ اپنے ہاں کے چار دیواریوں کے باہر کسی کو انسان تسلیم

Marfat.com

نہیں کرتی حتیٰ کہ خود ان کے ورنوں میں بھی سے کم از کم ایک ورن کے اندر انسانیت کی ذلت اور نفرت کے تمام امکانی تصورات جمع ہیں۔ اونچے ورن کا ہندو ان کے چھونے سے ہی نہیں بلکہ ان کے سایہ تک سے بھی بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں غیر ہندو سے نفرت اور لہٰذا عداوت ایک کھلا ہوا منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کے خلاف یہی وہ جذبۂ نفرت تھا جسے انھوں نے تاریخی افسانوں سے ہوا دی اور ہر ہندو کے دل میں حتی قدر حوصلۂ انتقام کی آگ بھڑکا دی گئی۔ اسی آگ کے شعلوں کی لپیٹ ہے جس سے بھارت ورت کی چار دیواری میں مسلمانوں کے لئے زندگی جہنم بن رہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے ارباب حکومت سیاسی مصالح کی پیش نظر مسلمانوں کے تحفظ کا یقین دلاتے رہیں اور اس کی توثیق معاہدات سے بھی کر دیں لیکن وہاں کے مسلمانوں کو ان ارباب حکومت کی کوٹھیوں میں زندگی بسر نہیں کرنی۔ انھیں وہاں کی ہندو جاتی میں زندگی گزارنی ہے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ وہاں کے ارباب حکومت ہر مسلمان کے ساتھ ایک ایک باڈی گارڈ مقرر کر دیں گے اور جو ان کے جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا رہیگا۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو باڈی گارڈ بھی کسی کی کہاں تک حفاظت کر سکتے ہیں حکومت کے انتظامات جاتی کے ہاتھوں مہاتما گاندھی جیسی شخصیت کی حفاظت نہ کر سکے۔ تو کیا وہ انتظامات وہاں کے چار کروڑ مسلمانوں کی فی الواقعہ حفاظت کر سکیں گے؟ این خیال است و محال است و جنوں۔

ہندوؤں کا پروگرام بالکل واضح ہے اور جن لوگوں نے تقسیم ہند سے کچھ

Marfat.com

عرصہ پہلے مہاتما گاندھی کی ان تقریروں کو غور سے سنا تھا۔ جو وہ دہلی سے نشر کیا کرتے تھے وہ اس کی تائید کریں گے کہ ہندوؤں کے پیش نظر شروع ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان جو بالعموم تعلیمیافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے جداگانہ قومی تشخص (یعنی مسلمان ہونے) کا عقیدہ محکم طور پر رکھتے تھے۔ انھیں یا تو تہ تیغ کر دیا جائے یا پاکستان جانے پر مجبور باقی رہے دیہاتی مسلمان تو وہ ایک آدھ نسل کے بعد خود بخود ہندوؤں میں جذب ہو جائینگے

ان حالات کے تحت یہ سمجھنا کہ ہندوستان کا مسلمان وہاں بحیثیت مسلمان زندہ اور باقی رہ سکیگا۔ خود فریبی سے کم نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ کا حل سوائے تبادلۂ آبادی کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اگر تقسیم ہند معتدل حالات کے ماتحت وجود میں آتی۔ تو اس مسئلہ کا حل اسی وقت کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت ملک کی تقسیم کا معیار اس وقت کی اکثریت کے علاقے قرار نہ پاتے بلکہ اس کی جگہ ہوتا یہ کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے غیر مسلموں اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں سے کہدیا جاتا کہ جس کا جی چاہے وہ ایک معینہ مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ انتقال مکانی کے ساتھ ان کے املاک اور اموال کے تحفظ کی ضروری ضمانت بھی دی جاتی۔ یہ انتقال آبادی انگریزی حکومت کے زیر انتظام طے پاتا۔ جب اس طرح آبادیاں منتقل ہو جاتیں۔ تو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ملک کے رقبہ کی تقسیم کی جاتی اور یہ تقسیمی خطوط پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے حدود قرار پاتے۔ لیکن بدقسمتی سے

حالات ایسے پیدا ہو گئے یا کر دیئے گئے کہ جن کے ماتحت ایسا نہ ہو سکا اور جو ابھی کل شام تک اپنے مکانوں اور دوکانوں پر پاکستانی جھنڈے لہرا رہے تھے دوسری صبح انھوں نے دیکھا کہ ریڈکلف کی ابرو کے ایک اشارہ نے انھیں بھارت ورش کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک اب بھی اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ جو کچھ اس وقت نہ ہو سکا اسے اب کر لیا جائے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان معاہدہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان کی حدود مملکت میں بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہدیا جائے کہ جس کا جی چاہے اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس تبادلۂ آبادی کی ذمہ داری متعلقہ حکومت اپنے سر لے اور منتقل ہونے والے باشندوں کی جائدادوں کے انتقال کی ضمانت بھی دے۔ یہ سب کچھ ایک مدت معینہ کے اندر مکمل ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد آبادی کے تناسب سے ملک کے رقبہ میں مناسب ترمیم کی جائے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اس تبادلہ آبادی میں بہت سی انتظامی دشواریاں پیش آئیں گی لیکن وہ دشواریاں بہرکیف اور بہرحیثیت ان مستقل مشکلات اور مسلسل بدامنی سے کم ہوں گی جو غیر مطمئن رعایا کو مجبوراً اپنے ہاں رکھنے سے دونوں مملکتوں کو پیش آتی رہیں گی۔ اس تین برس کے عرصہ کو دیکھیئے۔ فکری تدبیروں اور انتظامی کارکردگیوں کا بیشتر حصہ اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلہ کی نظر ہو گیا۔ اور اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ کوئی اطمینان بخش صورت پیدا ہو سکی بلکہ حالات اس درجہ نازک ہو گئے کہ اگر بعض موانع

Marfat.com

حائل نہ ہوتے تو ان دونوں مملکتوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی۔ جو کچھ اس تین سال کے عرصہ میں ہوا ہے وہی کچھ مستقل طور پر ہوتا رہے گا۔ ہندو جاتی اپنی اس ذہنیت کے ماتحت جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مسلمان کو دہری مار مارتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں پر بے حد مظالم ہو رہے ہیں اور اس طرح پاکستان کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں پر گویا عافیت تنگ کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگ آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انہیں خود تو اس طرح بھاگ آنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر ان کے چلے آنے کے بعد شور یہ مچایا جاتا ہے کہ پاکستان بھارت میں بدامنی پھیلانے کے لئے یہاں کی مسلمان رعایا کو اکسا اکسا کر اپنے ہاں بلا رہا ہے ابھی پچھلے معاہدہ کو دیکھئے۔ پاکستان میں ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا جو انہوں نے ہندوستان مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ لیکن معاہدہ کی تہبید میں انہوں نے پاکستان کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو برابر کا ملزم تسلیم کرے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے پراپیگنڈے کے اثر سے بین الاقوامی ادارے پاکستان کو کچھ زیادہ ہی ملزم سمجھتے ہیں کہیے کہ ان حالات میں کس طرح امن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں مملکتوں میں خوشگوار تعلقات کے قائم کرنے کی اطمینان بخش صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ باہمی رضامندی اور مفاہمت سے تبادلۂ آبادی کو ممکن بنا دیں۔ اور اس طرح ہمیشہ

کے لئے ان خار دار جھاڑیوں سے نجات پالیں۔ یہ کچھ اول و آخر زود یا بدیر کرنا ہی ہوگا جتنی جلدی یہ کرلیا جائے اتنا ہی یہ دونوں مملکتوں کے حق میں نفع بخش ہوگا۔ جتنی دیر کی جائے گی دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔ کچھ عرصہ پیشتر ترکوں اور یونانیوں کی ملحقہ مملکتوں کو بھی اسی قسم کی دشواری پیش آئی تھی۔ انھوں نے سیاسی عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور باہمی سمجھوتے سے متعلقہ حکومتوں کے زیر اہتمام تبادلہ آبادی کے مراحل طے کرلئے۔ اور اس کے بعد دونوں مملکتیں امن چین سے رہنے لگیں۔ اگر یہ کچھ وہاں ہوسکتا تھا۔ تو یہاں کیوں نہیں ہوسکتا۔

ہماری پیشکردہ تجویز کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہوسکتی ہے جب اس پر ہندو بھی رضامند ہو۔ لیکن اگر ہندو اس پر رضامند نہ ہو تو؟ یہ صورت واقعی غور طلب ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ پاکستان کا مسلمان اپنی ہندو اقلیت کی حفاظت بہرحال کرے گا۔ اس لئے کہ اس کا فلسفہ زندگی اسے ظلم اور ناانصافی کی کبھی اجازت نہ دے گا۔ لہٰذا سوال کی نوعیت یوں ٹھہری کہ اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ ہو تو کیا ہندوستان کے مسلمان پر پاکستان کے دروازے بند کردیئے جائیں۔ اور اس طرح انھیں بے کسی اور بے بسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ یا تو ذلت کی زندگی جئیں اور یا بے چارگی کی موت مریں۔ بالفاظ سیاسی اعتبار سے اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ سیاسی اعتبار سے وہاں کے مسلمان بھارت کی

Marfat.com

رعایا ہے۔ اور اسے اپنے معاملات اپنی حکومت سے خود سلجھانے چاہئیں۔ ہم اپنے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بہبود کے ذمہ دار ہیں۔ دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمانوں سے سوائے لفظی ہمدردی کے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے سیاسی نقطۂ خیال سے یہ جواب نہایت مدلل اور یہ طرز عمل بالکل مناسب ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک مسلمان (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے انسان) کے نزدیک بھی یہ جواب معقول اور اسلوب فکر مناسب قرار پائے گا۔ جیسا کہ ہم اپنی آزادی کی دس سالہ جدوجہد میں اعلان کر چکے ہیں (اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے دعوے آزادی کی بنیاد ہی اس مسئلہ پر تھی) مسلمان کی قومیت کا مدار کسی ملک کی حدود نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کی قومیت

اسلامی قومیت کا مدار

وحدت فکر و عمل سے ترتیب پاتی ہے۔ جس کا نام دین کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ ہم نے اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو انگریز اور ہندو دونوں سے اسی بنیادی حقیقت کی بنا پر منوایا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم تھی۔ مسلم ہے اور مسلم رہے گی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار ایمان کے سوا اور کسی شرط پر نہیں۔ بنا بریں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ملکی تقسیم کا خط ادھر کے مسلمانوں کو ہم سے الگ، قوم نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس تقسیمی خط کو جداگانہ قومیت کا معیار قرار دیتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی تقاضے سے علی الاعلان انکار کرتا ہے۔ بلکہ یہی کرہ دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ ہماری جنگ

Marfat.com

آزادی میں جداگانہ قومیت کا تقاضا محض ایک وکیلانہ حربہ تھا یا۔ اسی چال خدا پناہ میں رکھے ایسے شخص سے جو قرآنی حقیقت کا اس طرح انکار کرے اور پوری کی پوری ملت اسلامیہ پاکستانیہ کو ایسا منافق ثابت کرے۔ لہذا اس حقیقت کبریٰ میں کسی شبہ یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ایک ہی ملت کے افراد اور ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ اس لئے اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ بھی ہو تو ہم کسی صورت میں بھی ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا دروازہ بند نہیں کر سکتے۔ ہماری سیاست کا مرکز حریم کعبہ ہے جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ سواء العاکف والباد ہے۔ یعنی اس کے دروازے وہاں کے رہنے والوں اور باہر کے آنے والوں سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہم جس مقام پر بھی اسلامی حکومت کے قیام کا ارادہ کریں گے۔ کعبہ کا سیاسی قانون ہمارے آئین دستور کی بنیاد ہوگا۔ اس لئے اگر کعبہ کا دروازہ ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں میں تمیز نہیں رکھتا اور ہر ایک کے لئے کھلا کھلا اعلان کرتا ہے کہ ومن دخلہ کان اٰمنا یعنی جو بھی اس گھر میں داخل ہو گیا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو گیا۔ تو وہ کون مسلمان ہے۔ جو قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ پاکستان کا دروازہ ہندوستان کے مسلمانوں پر بند ہے؟ ہماری سیاسی مصلحت کوششوں کے تقاضے کچھ بھی ہوں۔ لیکن دین کا تقاضا ان سب پر غالب رہے گا۔ اور اگر ہمارے لئے قول

مرکز امن

Marfat.com

فیصل دینی تقاضا نہیں ہے۔ بلکہ سیاسی مصلحت کوشیاں اور ہنگامی مفاد انگیزیاں ہیں تو پھر ہمیں ان اعلانات سے فوراً دست بردار ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان اسلامی دستور زندگی کی تشکیل کے لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔

بنا بریں یہ خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ کہ جو مسلمان اس وقت پاکستان میں ہیں۔ پاکستان انہی کا گھر ہے۔ اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ وہ غیر ہیں۔ ان کا اس گھر میں کوئی حصہ نہیں۔ پاکستان وہ مسجد ہے۔ جس میں ہر مسلمان کا برابر کا حصہ ہے۔ اور قرآن کے فیصلہ کے مطابق اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کی مسجد میں آنے سے روکنے کے لئے پاکستان کے دروازے ہندوستان کے مسلمانوں پر کسی صورت میں بھی بند نہیں کئے جا سکتے ولوکرہ المشرکون لہذا ہمیں ان مسائل کے دوسرے حل تلاش کرنے ہوں گے۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے پاکستان میں آنے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ دردسر کا علاج سر کو الگ کاٹ کر پھینک دینے سے نہیں ہوا کرتا۔ جو طبیب اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں جانتا، وہ جتنی جلدی اپنی دعوئے طبابت سے دست کش ہو جائے۔ اتنا ہی نوع انسانی کے لئے مفید ہو گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس اتنی کثیر آبادی کے لئے گنجائش کہاں ہے ہم پوچھتے ہیں کہ اگر دس برس میں پاکستان کے موجودہ مسلمانوں کی اپنی آبادی ہی سوا ئی

Marfat.com

یا ڈیوڑھی ہو جائے۔ تو کیا آپ آبادی کے اس اضافہ کو بحیرۂ عرب میں ڈبو دیں گے؟ اس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔ جو کچھ اس وقت کیا جائے گا۔ اسے آج ہی کر لیجئے حکومت کرنے والی قوموں کے تدبر کی آزمائش ایسے ہی مسائل کے حل سے ہوا کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی کہا جائے کہ سوال جگہ کا نہیں۔ معاشی مشکلات کا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ پاکستان کے معاشی ذرائع اتنی آبادی کے کفیل ہو سکتے ہیں یا نہیں صحیح اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے۔ اگر اس کی تقسیم مساویانہ حیثیت سے کر دی جائے۔ تو یہی ذرائع کم از کم چار گنا زیادہ آبادی کی ضروریات زندگی کے لئے بآسانی مکتفی ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا صحیح طریق یہ ہے کہ ان ذرائع پیداوار (زمین۔ کارخانے۔ معدنی ذخائر وغیرہ) کو افراد کی ملکیتیں قرار دینے کی بجائے ملت کی مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے۔ جس کے ماحصل میں ہر فرد ملت کا برابر کا حصہ ہو[1]۔ بس غریب کے گھر میں چار روٹیاں پکتی ہیں۔ اس کے آٹھ افراد خاندان آپس میں آدھی آدھی روٹی بانٹ لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک شخص پیٹ بھر کر کھا لے اور باقی سات بھوکے سو رہیں۔ اس وقت ہم پر ایسا ہی وقت آ پڑا ہے اور اس مشکل کا حل بھی یہی ہے۔ اس وقت سارے پاکستان میں ذرائع پیداوار چند گنتی کے خاندانوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہی ہیں جو یہاں کے غریبوں کو انسانی سطح پر آنے نہیں

معاشی حل

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "قرآنی دستور پاکستان" شائع کردہ طلوع اسلام۔

Marfat.com

دینا چاہتے۔ اور یہی ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی وہیں بند رکھنا چاہتے ہیں اگر ان تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیدیا جاتے۔ تو ان سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے موجودہ مسلمانوں ہی کی اقتصادی سطح بلند ہو جائے گی۔ بلکہ یہ بھی کہ ہم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو جوں توں بسا سکتے ہیں۔ ہماری مشکل معاشی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ مترفین کا گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے۔ اور خدا کی ربوبیت کو عام نہیں ہونے دیتا۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر ارباب حکومت کے دل میں اس مسئلہ کے حل کی تلاش کا جذبہ صادق موجود ہو تو اس کے لئے صرف عزم راسخ کی ضرورت ہے۔ باقی سب کچھ یہاں موجود ہے ولما فتحوا متاعهم وجدوا بضاعتهم ردت اليهم ہمارا سامان زیست خود ہماری اپنی بوریوں میں بند ہے۔ بس سوال ان بوریوں کے منہ کھول دینے کا ہے۔

جو کچھ گزشتہ صفحات میں گذارش کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) اقلیتوں کے مسئلہ کا اطمینان بخش اور موثر حل پاکستان اور بھارت دونوں مملکتوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

(۲) ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا مستقل، موثر اور قابل اطمینان حل اس کے سوا اور

Marfat.com

اور کچھ نہیں کہ اقلیتوں کو اپنے اکثریت کے علاقوں میں کسی مدت معینہ کے اندر چلے جانے کی کھلی اجازت دیدی جائے ..... اور جس ملک میں فاضل آبادی انتقال مکانی کرے۔ اسے مزید علاقہ دیدیا جائے۔ جتنی جلدی اس حل کو اختیار کیا جائے گا اتنا ہی ہر دو مملکتوں کے لئے مفید ہوگا

(۳) ان حالات کے پیش نظر حکومت پاکستان اور حکومت ہندوستان کے مابین اقلیتوں کے تبادلہ اور اس کے تضمنات کے متعلق گفت و شنید شروع کر دینی چاہیئے۔

(۴) جب تک یہ امور عملی طور پر طے نہ پا جائیں۔ اتنے غرصہ کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان وہاں امن سے دن بسر کر سکیں اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انہیں وہاں بے یار و مددگار نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ ان سربرآوردگانِ قوم کو جو انھیں چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ واپس بھیج دیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت ہند ان کی واپسی میں مزاحم نہ ہوگی۔

(۵) اگر یہ سربرآوردگان قوم جانے پر تیار نہ ہوں۔ یا ان کی مراجعت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو اطمینان نصیب نہ ہو۔ تو آخری حل کے مذاکرات کے دوران میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ صرف پاکستان آنے کی اجازت ہونی چاہیئے بلکہ اس باب میں ضروری سہولتیں بھی بہم پہونچانی چاہئیں۔

(۱) ان تدابیر کے ساتھ ہی خود پاکستان میں مسلمانوں کی موجودہ آبادی

Marfat.com

اور ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کو امن اور خوشحالی کے ساتھ بسانے کے مختلف طریقوں پر غور و فکر کرنا چاہیئے. ان میں سب سے اہم مسئلہ معاشی ہے جس کا حل یہ ہے کہ پاکستان کے تمام ذرائع پیداوار کو انفرادی ہاتھوں سے نکال کر قومی ملکیت قرار دیا جائے. اور اس طرح ان ذرائع کے ماحصل کی تقسیم تمام باشندگان پاکستان کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق کی جائے. کہ. یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ. یہی ہے وہ اسلامی سوشلزم جس کے متعلق ہمارے وزیر اعظم امریکہ میں بار بار اعلان فرما چکے ہیں.

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

(نوشتہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء)

Marfat.com

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری

لاہور سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ اسلام تمام نوعِ انسان کو ایک برادری قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح وحدتِ حیات سے ایک عالمگیر اخوت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ لیکن باقی مذاہب والوں سے بات کیجئے (بالخصوص عیسائیوں اور ہندوؤں سے) تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کے ہاں تمام انسانوں کو ایک برادری بتایا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اسلام کا یہ دعوےٰ اپنے اندر کیا خصوصیت رکھتا ہے۔

جواب۔

کہنے کی بات کا تو یہ عالم ہے کہ آجکل یہ فیشن ہو رہا ہے کہ کوئی اہم نظریہ سامنے آئے۔ ہر مذہب اور تہذیب کے مدعی فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نظریات و اصولات کی دنیا تو ایک طرف محسوسات کی دنیا تک میں یہی ہے۔ چنانچہ آپ نے عام ہندوؤں کو کہتے سنا ہوگا کہ ہوائی جہازوں کا ذکر رامائن میں ہے۔ اور مہاراج بھرت نے ہنومان کو ہوائی جہاز کے

Marfat.com

کے ذریعہ اجودھیا سے لنکا پہونچایا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتا۔ تو بھارت دیش کے راجاؤں کو بھیلیوں سے بڑھ کر کوئی سواری نصیب نہ ہوتی۔ لہذا حقیقی دلیل یہ نہیں کوئی کہتا کیا ہے۔ دلیل اصل یہ ہے کہ مدعی کی مذعومہ آسمانی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ ہندو تو کبھی اس باب میں سامنے آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ جن کے ہاں بھارت دیش کے باہر انسان نہیں ملیچھ بستے ہوں۔ اور خود بھارت کے اندر ہندو جاتی میں برہمن۔ کھشتری، شودر اور دیش کی ازلی پیدائشی تقسیم موجود ہو۔ اور جن کے ہاں اچھوت حیوانات سے بدتر سمجھے جاتے ہوں۔ اور یہ سب کچھ ویدوں اور سمرتیوں کی تعلیم کے مطابق ہو رہا ہو انھیں کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ انسانیت کی عالمگیر برادری کا نام بھی لے سکیں۔ باقی رہے عیسائی۔ سو ان کے ہاں واضح الفاظ میں موجود ہے کہ خدا کا پیغام صرف قوم بنی اسرائیل کے اندر محصور رہے گا۔ غیر بنی اسرائیل تک اس پیغام کا ایک لفظ تک نہیں پہونچایا جائے گا۔ انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

انھیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی۔ باب ۱۰ آیات ۵-۶)

اسی کی تفسیر میں دوسری جگہ ہے۔

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو (متی ۷)

سو ظاہر ہے کہ جس تعلیم کی مخاطب صرف ایک قوم بنی اسرائیل ہے اس میں انسانیت کا عالمگیر تصور کہاں سے آسکتا ہے؟ یہ قرآن ہے جس نے یا ایھا الناس (اے نوع انسانی) کے تخاطب سے تمام انسانیت کو دعوت دی۔ اس نے خدا کو رب العالمین۔ قرآن کو ذکر للعالمین اور رسول کو کافۃ للناس (تمام نوع انسانی کی طرف رسول) کہہ کر پکارا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے تمام نوع انسانی کی پیدائش کا سرچشمہ "نفس واحدۃ" قرار دے کر صرف نظری اعتبار سے نہیں بلکہ بطور ایک حقیقت نفس الامری کے وحدت انسانیت کا اعلان کیا۔ اگر کسی اور مذہب میں اس حقیقت کا ذکر ہے۔ تو اس سے کہیے کہ فاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ ورنہ زبانی دعاوی میں کون پیچھے رہتا ہے۔؟

Marfat.com

نیابتِ الٰہی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ عام طور پر کہا جاتا ہے (اور اسلامی جماعت کی طرف سے اسے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے) کہ اسلام میں حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور ملت اسلامیہ اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتی ہے۔ حکومت پاکستان نے اپنی قرار دادِ مقاصد میں بھی یہی لکھا ہے کہ اختیارِ اعلیٰ Sovereignty خدا کے لئے ہے۔ لیکن اس نے اپنے اختیارات بندوں کو تفویض Delegate کر دیئے ہیں۔ یہ تصور تھیوکریسی Theocracy کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یہی کہا جاتا تھا کہ اصل اختیار تو خدا کو حاصل ہے۔ لیکن انہی Divine Rights کو بادشاہ استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنے ہاں مردِ مومن کو نائب حق کہا ہے۔ ان دونوں تصورات میں کیا فرق ہے؟

جواب۔

ہمارے نزدیک نیابت الٰہی کا تصور صحیح نہیں۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ ہم نے اپنے اختیارات کسی اور کو تفویض Delegates کر دیئے ہیں خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا انسانوں کی جماعت۔ اور اب وہ بادشاہ یا جماعت خدا کے Behalf پر دنیا میں حکومت کریں گے۔ نیابت کی سند میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے خلیفہ کے معنی جانشین Successor ہیں۔ اور جانشینی اس کی کی جاتی ہے۔ جو خود موجود نہ ہو۔ اس لئے خدا کا جانشین Successor ہونے کا تصور غلط ہے (خلیفہ کے صحیح تصور کے لئے معارف القرآن کی دوسری اور چوتھی جلد ملاحظہ فرمایئے) جماعت اسلامی کے سامنے تھیوکریسی ہی کا تصور ہے۔ ان کے نزدیک زمام حکومت ارباب مذہب کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ جو خدا کے نائبین کی حیثیت سے حکومت کریں گے۔ نائبین زمین پر خدا کا سایہ ہوں گے کیونکہ ان کے خیال کی رو سے سلاطین ظل اللہ ہوتے ہیں۔ انہی کی غوغا آرائی سے ہمارے ارکان حکومت بھی متاثر ہو گئے۔ اور انھوں نے قرارداد مقاصد میں انہی کی تقلید میں یہ لکھ دیا کہ حکومت خدا کے تفویض کردہ اختیارات Delegated Powers کو استعمال کرے گی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے انسان نہ خدا کا نائب ہے، نہ خلیفہ۔ اور نہ ہی خدا نے اپنے اختیارات تفویض

کئے ہیں۔ اسلام تھیوکریسی کے اس تصور کو مٹانے کے لئے آیا تھا

جو قوم دنیا میں حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کی عمارت کن بنیادوں پر استوار ہوگی۔ جب تک یہ اصول طے نہ پا جائیں اس وقت تک کسی حکومت کا قیام آئینی طور پر صحیح نہیں ہوتا۔ عام حکومتیں خود اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی حکومت کی بنیادیں متعین کرتی ہیں۔ لیکن جس حکومت کا تصور قرآن نے دیا ہے۔ اس میں حکومت انسانی ذہنوں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق متشکل نہیں ہوتی۔ بلکہ ان اصولوں کے مطابق قائم کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرہ کے لئے متعین فرمائے ہیں۔ اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ یعنی یہ وہ حدود اللہ ہیں جس کے اندر انسان اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآنی حکومت انسانی اختیارات و باہمی معاملات کی حدود متعین کرتی ہے۔ یہ حدود غیر متبدل ہیں۔ اور تمام نوع انسانی کو محیط ان حدود کے اندر انسان اپنے اختیارات کے استعمال میں خود مختار ہوتا ہے جس طرح فٹ بال کی گراؤنڈ میں حدود و قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر کھلاڑی اپنے جوہر کے مظاہرے میں صاحب اختیار ہوتا ہے ان الحکم الا للہ سے یہی مفہوم ہے حکم کے معنی ہی روکنے کے ہیں۔ اور خدا کے حکم سے مفہوم یہ ہے کہ وہ بتائے کہ انسانی اختیار کو کہاں رکنا ہے۔ یہ حکومت خدا کی جانشین نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کے اختیارات خدا کے تفویض کردہ Delegated ہوتے ہیں۔

Marfat.com

انسان صاحب اختیار ہے۔ جو قوم اپنے اختیارات کو اپنی وضع کردہ حدود کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ وہ غیر قرآنی حکومت کہلاتی ہے۔ اور جو قوم ان اختیارات کو قرآنی حدود کے تابع استعمال کرتی ہے۔ اسے قرآنی حکومت کہا جاتا ہے۔ طلوع اسلام نے جب کبھی قرآنی حکومت یا خدا کی حکومت کا نام لیا ہے تو اس سے مقصود اسی قسم کی حکومت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ہاں نائب حق کی اصطلاح ضرور ملتی ہے لیکن اگر ان کی پوری تعلیم کو سامنے رکھا جائے۔ تو یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان کے پیش نظر تصور وہی تھا۔ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور جو تھیوکریسی کے یکسر مخالف ہے۔ وہ اس اصطلاح کو استعمال نہ فرماتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ اس سے بعد میں التباس کا امکان ہو سکتا ہے۔

نوجوانوں کے دل کی دھڑکن

اس خط کو ملاحظہ فرمایئے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام کراچی۔ تسلیم: طلوع اسلام کافی عرصے سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے۔ اور آپ کی روشن دماغی مسلم۔ قرآن فہمی میں جو ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ شاید ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحہ تاریخ پر ثبت ہیں۔ وہ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرنا چاہیں۔ تو میرا خیال ہے۔ یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی۔

اسلامی نظام ایک واہمہ ہے

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی یہ

Marfat.com

خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق بار بار یہ دُہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام صرف ایک واہمہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ امرا اور حکمراں طبقے کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سلا سکتے ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں سے اس کا اثر زائل ہی نہیں ہونے دیتے۔ اس کے سوا اگر اور کوئی اسلامی نظام ہے۔ تو وہ ممکن ہے کہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن میں موجود ہو تو ہو مگر آج تک نہ تو تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک دیکھی۔ اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکیگی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اور خدا کی مشیت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور اگر کوئی مستقل نظام اس پر مسلط کر دیا گیا۔ تو اس کا ارتقا رک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا اسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے۔ وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر رائج نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس

Marfat.com

دورِ اول کی تاریخ

وقت جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اول کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا[1]۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا کیا حشر ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے۔ ان کا کیا حشر ہوا اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کون سا صفحہ، صفحہ نہیں سطر بلکہ وہ کون سا لفظ ہے۔ جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام صرف خلافت راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا گیا۔ اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہیں دی گئی۔ اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لٹکا کر کیوں علیؓ کی فوج کو لڑنے سے روک دیا۔ اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھکر بذریعہ ثالثی کیا جائے۔ اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہ عشرہ مبشرہ موجود

---

[1] خلیفہ اول کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

Marfat.com

نہ تھے۔ وہ صحابہؓ موجود نہ تھے۔ جنھوں نے رسول پاک کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاک کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونے والے صحابہؓ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔ وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے۔ اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزارہا سال تک چلتا رہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار ان تو محمل تک جا پہنچے ہیں اور آپ اپنی قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دور وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔

اسلامی آئین کیا ہے

آپ کس نظام کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں آج تک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی

Marfat.com

آئین اسلامی کی کوئی کتاب چھپی۔ یا ویسے آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے۔ آپ قرآن کی ایک دو آیت پڑھ کر تفسیر کرنے لگیں گے۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے۔ وہ بخاری۔ مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دے گا۔ شیعہ سے دریافت کیا جائے۔ تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا۔ اور باقی فرقوں کے لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا۔ مگر آج تک نہ ہی کسی فرقے کے علماء نے آئین کی کتاب مرتب کی ہے۔ اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علماء نے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے۔ مگر اسے قرآن۔ حدیث یا فقہ کا منشا نہیں کہا جا سکتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانے کے مطابق ترقی یافتہ لائنوں پر وضع کیا جائے۔ تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں۔ اور عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اسے اس سے نجات دلا سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی سبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا۔ تو اس کا حشر معلوم۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے۔ اور یہاں بھی وہی

تاریخ دہرائی جائے گی۔ یہ مرزائی ہے۔ اسے وزارت خارجہ سے الگ کردو اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو۔ یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب وشتم کرتا ہے۔ یہ وہابی ہے یہ فقہ کو نہیں مانتا اُسے بھی نکال دو۔ اور یہ اہل قرآن ہے اسے بھی کراچی سے شہر بدر کردو کیونکہ یہ محدثین کی عزقریزی سے جمع کی ہوئی احادیث کا منکر ہے اس لئے کافر ہے اور یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کون سا اسلامی نظام قائم کریں گے۔ کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے۔ اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کرینگے۔ کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اول پاکستان تسلیم کریں گے۔ نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کریں گے۔ اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہوگا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے۔

آپ میرا یہ طویل خط جس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں پڑھ کر مجھے گمراہ کہہ سکتے ہیں۔ کافر کہہ سکتے ہیں۔ کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ مگر خدارا حقائق کو نظر انداز نہ کریں قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں۔ بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں۔ یہ ایک واہمہ ہے۔ خوش اعتقادی ہے۔ ہٹ

Marfat.com

دھرمی اور ضد ہے۔ جس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آئین بنا کر بھیجا ہوتا۔ تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لئے حالات پیدا کر دیتا۔ اور اپنے ہمہ گیر آئین سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا۔ اس کا آئین یہی ہے جو چل رہا ہے۔ اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم و تنسیخ بھی ہوں گی۔ ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہترین آئین نافذ بھی کیا جائے گا۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے۔ جو ازل سے ابد تک چلی جائے گی۔

یہ عریضہ بے ربط سہی یا محض جذباتی ہی سہی۔ مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے۔ تو اسلامی آئین کیسے نافذ کریں گے۔ جس نظام کو پہلے دو خلفا نے مضبوط کیا۔ وہ عثمانؓ اور علیؓ کے دور خلافت میں کیوں روبہ انحطاط ہو گیا۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت الٰہی نہیں تھی کہ نظام ختم ہو کر ایک اور نظام جنم لے اور پھر ایک اور، اور، اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔

میں پھر اس طویل خط کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ سے

مطالعہ کرکے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لئے استعمال کریں گے انھیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہونچادی ہے۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی۔

احقر - زیادہ آداب

طلوع اسلام

اس خط کو ہم نے اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہوکر ذہنی انتشار کا باعث اور انھیں اسلام کی طرف سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ بنابریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوع اسلام دیا جائے۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت کچھ غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کرکے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لئے قائم ہوا اور اس کے بعد ختم ہوگیا۔ اگر یہ نظام مبنی بر صداقت تھا۔ اور

Marfat.com

اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ تو ہمیشہ کے لئے کیوں قائم نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے۔ اس لئے اس نظام کے احیاء اور از سر نو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیئے۔ جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

اسلامی نظام آگے کیوں نہ چلا

معترضین کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے چند لمحات کے) کوئی دور بھی ایسا نہیں آیا۔ جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گزشتہ تاریخ کو تو چھوڑیئے ہر شخص اپنے زمانے پر نگاہ ڈالے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا

Marfat.com

برا کہے۔لیکن (قریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل سچ
جائے۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا۔ اور آج
بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو۔ اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ
بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا۔ چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں اس لئے
راہ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو محکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام
جائے۔ اللہ میاں نے یہ کہہ کر کہ جھوٹ بری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ)
ناکام ثابت ہوا۔ اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا
بھلا چلتا رہا ہے۔ اس لئے یہی راہ صواب کی ہے

اسے بھی چھوڑیئے۔ روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ ہر فرد ذیابیطس کا مریض
طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لئے موجب ہلاکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ
دیکھیں گے (کہ چند مستثنیات کے علاوہ) ہر مریض میٹھا کھا لیتا ہے۔ اور پھر چیختا چلاتا
کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض
تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے۔ اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی
مندرجہ بالا دلیل کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں
اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے۔ اس لئے یہ اصول
ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کے لئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس
کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

Marfat.com

اسلام اور مسلمانوں میں فرق

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے۔ اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطہ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم تنزل میں گر گئی۔ اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطہ زندگی بنایا۔ اور زندگی کی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ کچھ وقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ اور ان نتائج سے محروم ہو گئی جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمایئے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ نہ رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کا ساتھ دے سکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ کہیئے۔ ہم دیکھیں

کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا انھیں دنیا پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملے گا۔

کیا اسلام آگے بڑھ رہا ہے یا نہیں؟

(۱) نزول قرآن کے وقت یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت Monarcny ایک ایسا مسلمہ نظام حکومت تھا۔ جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آسکتا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اس کے حقوق خداوندی Divine Rights کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فساد آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پر یہ حق لے کر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہر ذاتی ہے۔ نہ کہ نسبی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا۔ اور اس کے انسانیت

Marfat.com

سازِ نتائج سے بہرہ یاب ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ یا اس اصول کی طرف جسے نزولِ قرآن سے پیشتر ایک مسلمہ کی حیثیت سے عام اصول مانا جاتا تھا۔

ملوکیت دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ جسے قرآن نے تجویز کیا تھا۔ اور اس راستہ کو چھوڑ کر چکی ہے (یا چھوڑتی چلی جا رہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں۔ اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ خود اس اصول کو اختیار کئے جا رہے ہیں۔ جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانے کے تقاضے مار مار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا موجود ہو۔ جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظامِ حکومت ہے

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کر رہی ہے۔ یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کے لئے چلا تھا۔ یا یہ ۱۳ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

پیشوائیت (۲) نزولِ قرآن کے وقت ایک مسلمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان

Marfat.com

ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انھیں نبی
یا Priests کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا
اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رو سے) براہِ راست ہے اور
پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو
اپنایا۔ اور ان کے قلوب و اذہان ان زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ جو پیشوائیت کی
عقیدت مندیاں وضع کئے چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس اصول کو
چھوڑ دیا اور ملائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی۔ لیکن آپ
دیکھئے کہ آج انسانیت کا رخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف
آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے۔ اور اس سے نجات
حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے

مدارِ قومیت (۳) نزولِ قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں
میں بٹے ہوئے تھے اور نسلی و جغرافیائی امتیازات انسان اور
انسان کے درمیان حدِ فاصل بن رہے تھے۔ قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حد بندیوں
بندیوں کو مٹایا۔ اور انسانوں کو اس اصلِ عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں
کی پیدائش نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے تمام انسان بلا تمیز نسب و وطن
ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا
نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت

Marfat.com

کچھ عرصہ بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا۔ اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور حدود سازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے۔ یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے۔ کہیے کہ انسانیت اسلام کے بنائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے۔ یا اس اصول کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا۔

سرمایہ داری

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتے تھے اور اس طرح زیر دست انسانوں کا خون چوستے تھے۔ قرآن نے یہ انقلاب آفریں اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری ہے تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے۔ جو نظام اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو نہ زمین و آسمان کی برکتوں سے مالا مال ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اسے اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن دیکھئے یہ کہ اس میں عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف

Marfat.com

رہا ہے یا اسے انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا جا رہا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ خود پاکستان میں زمین پر آزاد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرے۔ جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا۔ یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی ملکیت میں رکھ سکیں۔ حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں۔ انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین میں وہ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مار مار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لا رہے ہیں۔ کہیئے، انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کر رہا ہے یا اپنے خود ساختہ نظام کو

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیش نظر مقصد کے لئے اتنی ہی مثالیں کافی ہیں۔ ان سے

ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے ازخود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جارہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بہت سست ہے۔ کیونکہ انسان انھیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہوجاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لاکر بلا تجربہ ان اصولوں کو اختیار کرلے۔ تو ان کے نتائج کی رفتار بہت تیز ہوجاتی ہے۔ اور ان میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

اب مرا سلنگار کے خط کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے۔ جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے۔ یعنی یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوئے تھے۔ تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے تھے اگر انسانی ہاتھوں نے انھیں آگے نہ بڑھایا۔ بلکہ انھیں چھوڑ دیا۔ تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گزری۔ یزید اور سادات میں کیا آویزش ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے

ہمارے اسلاف

مناقشات نے کیا شکل اختیار کی مسلمانوں کی باہمی کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ یہ تمام ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہے

اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک بیضلہ ہے اور وہ یہ کہ

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت

ولا تسئلون عما کانوا یعملون

یہ ایک قوم تھی جو گذر چکی۔ جو کچھ انھوں نے کیا ان کے نتائج ان کے لئے تھے اور جو کچھ تم کروگے اس کے نتائج تمہارے لئے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔

اس لئے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا بے کار ہے کہ انھوں نے کیا کیا اور کیوں ایسا کیا۔ طلوع اسلام سے کبھی یہ "سعی لاحاصل" سرزد نہیں ہوئی کہ آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے" وہ آنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی۔ لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا ہے۔ اسے اس گھناؤنے پردے کو چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے۔ کیونکہ "ہم اصحاب عشرہ میشرہ نہیں بن سکتے" تو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص عشرہ میشرہ کا محتاج نہیں ہے۔ اسے ہر زمانہ میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ وہی میشرین بن جائیں گے

قرآنی نظام اور اشخاص

آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب یہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اسے کس طرح قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گیا تھا۔ تو وہ ہی نظام آج بھی قائم ہو سکتا ہے عمرؓ کو عمرؓ اس نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ یہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کر دی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لئے ہوئے آج بھی اسی طرح موجود ہے جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کر کے وہی کچھ بن سکتے ہیں جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کو محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہو سکتا ہے یہ وہ حقیقت تھی۔ جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکیگا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے جو ہمیشہ تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے جو اسے قائم رکھنا چاہیں۔ اور انہوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل
افائن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم

محمد ایک رسول تھے۔ جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مر گئے یا قتل ہو گئے۔ تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟

Marfat.com

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشا یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کر
بہتر آئین نافذ کر دیا جائیگا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام
نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کر لیا جو تمام برائیوں کا منبع
اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کرکے اس
نظام قائم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے اصل یہ
آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد Rigid نظام ہے
انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کر
اسکی جگہ دوسرا نظام دیا جائے۔ اور یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ذرا یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظام
کیسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں
عدل کا اصول۔ دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے

اسلامی نظام کیا ہے؟

ہوں گے کہ ایسے اصول نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے
قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔ جو ظلم اور بد
اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ قائم
اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار Permanent Values
جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں یہ غیر متبدل ہیں۔ اسکے بعد اس نے کہا
زمانے کے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی
مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جنکی طرف

Marfat.com

گیا ہے۔ ہمیشہ برقرار رہیں گے اور انکی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے اتقا کے ساتھ ساتھ
جائیگا۔ اب آپ فرمایئے کہ اس قسم کے نظام میں آپکو کون سی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور
آپ کس طرح ناقابل عمل تصور کرتے ہیں کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہو سکا
اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر
تے ہیں تو آپ کے ذہن میں ملا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے جو یکسر قرآنی نظام
یض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں۔ ملا کے نظام
یت پر وارد ہوتے ہیں۔ جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدل قرار دی جاتی ہیں۔
اس قرآنی نظام کو سامنے رکھئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر
کہ آپ کے اعتراضات میں سے کونسا اعتراض باقی رہ جاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ اسلامی
شیعہ۔ سنی۔ وہابی۔ مرزائی چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہوگا۔ اور باقی فرقوں
کیا جائیگا۔ آپ غالباً علم نہیں کہ شیعہ سنی وغیرہ کے اختلافات ملا کی شریعت کے
وہ ہیں۔ قرآن میں جا کر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی
ہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں قرآن پر مسلمانوں
رد کا ایمان ہے۔ اس لئے وہ ہر مسلمان کے لئے قدر مشترک
بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں ہی کسی کو اختلاف نہیں۔ لہذا

ان امور کی تفاصیل کے لئے دیکھئے۔ "اسلامی نظام" اور "قرآنی دستور پاکستان"
طلوع اسلام

Marfat.com

اس حدتک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہوسکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی۔ تو اس کیلئے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رو سے طے ہوں گی۔ لہذا جو چیز ہماری باہمی مشاورت سے طے پاجائے اس میں اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطہ نظر پر کسطرح لایا جائے گا کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائیگا۔ یہی وہ چیز ہے جس کیلئے طلوع اسلام کوشش کر رہا ہے جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں اُن کیلئے کرنیکا کام یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی اس کوشش میں اسکا ہاتھ بٹائیں۔ — آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپکے

نوجوان طبقے کی مشکلات اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسکی وجہ سے ہم آپکے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتے اسلئے کہ ان خیالات کے آپ خود ذمہ دار نہیں ہیں۔ انکا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو مُلّا نے پیش کر رکھا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کیخلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں ایک طرف انہیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئن سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصور پیش کیا جاتا ہے جس سے عقل ابا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اسکے بعد انکے دل میں مذہب کیطرف سے نفرت اور اسکے تصورات کیطرف سے سرکشی کے جذبات نہ پیدا ہوں تو اور کیا ہوگا۔ اسلئے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے۔ اور اسی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ہم آپ سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ مُلّا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصورات کیلئے کریں اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کر سکتا ہے وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا اسلئے اس کا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے ۔

Marfat.com

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک میخانہ ے

ہمارے بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

زندگی کے اُن مسائل کے متعلق جن کی تفصیل فہرست میں درج ہے

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

قیمت مجلد، چھ روپے

Marfat.com